اِسلامی قانون

(یہ تقریر ۶ جنوری ۴۸ء کو لا کالج لاہور میں کی گئی)

آج کل کسی ملک میں ——— غیر مسلموں کے نہیں مسلمانوں کے اپنے ملک میں ——— اگر اسلامی قانون کے جاری کرنے کا سوال اٹھایا جائے تو اعتراضات کی ایک بوچھاڑ ہوتی ہے جس سے آدمی کو سابقہ پیش آتا ہے۔ کیا صدیوں کا پرانا قانون جدید زمانے کی ایک سوسائٹی اور اسٹیٹ کی ضروریات کے لئے کافی ہو سکتا ہے؟ کیا ایک خاص زمانے کے قانون کو ہمیشہ کے لئے قابلِ عمل سمجھنا حماقت نہیں ہے؟ کیا اس مہذب دور میں ہاتھ کاٹنے اور کوڑے برسانے کی وحشیانہ سزائیں دی جائینگی؟ کیا ہماری منڈیوں میں اب پھر غلام بکا کرینگے؟ اور آخر اس ملک میں مسلمانوں کے کس فرقے کی فقہ جاری ہوگی؟ پھر جو غیر مسلم یہاں رہتے ہیں وہ کیسے راضی ہو جائینگے کہ مسلمانوں کا مذہبی قانون ان پر مسلط کر دیا جائے؟ یہ اور ایسے ہی بہت سے سوالات ہیں جو تابڑ توڑ برسنے شروع ہوتے ہیں، اور یہ برسات غیر مسلموں کی زبان سے نہیں بلکہ مسلمانوں کے اپنے اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگوں کی زبان سے ہوتی ہے۔

اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ ان لوگوں کو اسلام سے کوئی دشمنی ہے۔ دراصل اس کی وجہ ناواقفیت ہے۔ آدمی کا خاصہ ہے کہ وہ جس چیز کو نہیں جانتا اس کا نام سُن کر طرح طرح کے وسوسے اس کے دل میں پیدا ہوتے ہیں اور دور کی شناسائی اُنسیت کے بجائے اکثر وحشت ہی بڑھاتی ہے۔ ہماری بدقسمتی کی طویل داستان کا ایک نہایت افسوسناک باب یہ بھی ہے کہ آج محض اغیار ہی نہیں، ہماری اپنی ملت کے لوگ بھی اکثر اپنے دین سے اور اپنے اسلاف کے چھوڑے ہوئے عظیم الشان ترکہ سے نابلد اور متوحش ہیں۔ اس حالت کو ہم اچانک نہیں پہنچ گئے ہیں بلکہ صدیوں کے مسلسل انحطاط نے ہمیں یہاں تک پہنچایا ہے۔ پہلے مدتہائے دراز تک ہمارے ہاں تہذیب و تمدن کا ارتقاء اور علم و فنون کا نشو و نما معطل رہا۔ پھر اس جمود کے نتیجے میں ہم پر سیاسی زوال آیا، اور دنیا کی مسلمان قومیں یا تو براہ راست

غیرمسلم حکومتوں کی غلام ہوگئیں، یا ان میں سے بعض کو کچھ آزادی حاصل بھی رہی تو وہ غلامی سے کم نہ تھی، کیونکہ شکست خوردگی کا اثر ان کے قلب و روح کی گہرائیوں تک اتر چکا تھا۔ آخر جب ہم نے اٹھنا چاہا تو ہر جگہ کے مسلمانوں کو، خواہ وہ غلام تھے یا آزاد، اٹھنے کی ایک ہی صورت نظر آئی اور وہ یہ تھی کہ جدید تہذیب و تمدن اور جدید علوم کا سہارا لے کر اٹھیں۔ ہمارے دینی علوم کے حامل جو طبقے تھے وہ خود اسی انحطاط میں مبتلا تھے جس میں ساری امت مبتلا تھی۔ دینی بنیادوں پر کوئی زندگی بخش اور انقلاب انگیز حرکت برپا کرنا ان کے بس میں نہ تھا۔ ان کی رہنمائی سے مایوس ہو کر امت کے بے چین طبقے دنیا کے اُس نظام زندگی کی طرف متوجہ ہو گئے جو صریحاً کامیاب نظر آرہا تھا۔ اُسی سے انھوں نے اصول لئے، اُسی کے علوم سیکھے، اُسی کے تمدنی اداروں کا نقشہ حاصل کیا، اور اُسی کے نقش قدم پر چل پڑے۔ رفتہ رفتہ اہل دین کا گروہ بالکل گوشۂ خمول میں پھینک دیا گیا۔ اور تمام مسلمان قوموں میں کار فرمائی کی باگیں اور کارکن طاقتیں انہی لوگوں کے ہاتھ میں آگئیں جو دین سے ناواقف اور تہذیب جدید کے فکری و عملی سانچے میں ڈھلے ہوئے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ایک دو کو چھوڑ کر تمام آزاد مسلم ممالک کی حکومتیں مغرب کی بے دین ریاستوں (Secular States) کے نمونے پر بن گئیں جن میں کہیں تو پوری اسلامی شریعت منسوخ ہو چکی ہے اور کہیں غیر دینی حکومت کے نظام میں مسلمانوں کے لئے محض ان کا پرسنل لا اسلامی رہنے دیا گیا ہے، یعنی مسلمانوں کی اپنی حکومت میں اُن کو صرف وہ مذہبی حقوق عطا ہوئے ہیں جو اسلامی حکومتوں میں کبھی ذمیوں کو دئے جاتے تھے۔[۱] اسی طرح جو ممالک غلام تھے اُن میں بھی تمام تہذیبی اداروں اور سیاسی تحریکوں کے کار فرما اسی قسم کے لوگ بنے، اور آزادی کی طرف ان کا جو قدم بھی بڑھا اُسی منزل کی طرف بڑھا جس پر دوسری آزاد مسلمان قومیں پہنچی ہوئی تھیں۔ اب اگر ان لوگوں سے اسلامی قانون اور اسلامی دستور کے نفاذ کا مطالبہ کیا جائے تو وہ بیچارے مجبور ہیں کہ اسے ٹالیں یا دبائیں، کیونکہ وہ اُس چیز کی ابجد تک سے ناواقف ہیں جس کے قیام و نفاذ کا ان سے مطالبہ کیا جاتا ہے۔ جو تعلیم اور ذہنی و عملی تربیت انھوں نے پائی ہے وہ انہیں اسلامی قانون کی روح و مزاج سے اتنی دور

---

[۱] اسلامی شریعت کی تنسیخ کا سلسلہ سب سے پہلے ہندوستان میں شروع ہوا۔ یہاں انگریزی (باقی صفحہ ۱۸۱ پر)

بے جا چکی ہے کہ اُس کو سمجھنا بھی ان کے لئے آسان نہیں رہا ہے۔ اور حاملانِ دین کی رہنمائی میں دینی تعلیم کا جو نظام چل رہا ہے وہ اِس وقت تک بیسویں صدی کے لئے بارھویں صدی کے مردان کار تیار کرنے میں مشغول ہے۔ اس لئے کوئی ایسا گروہ موجود بھی نہیں ہے جو شاگردانِ مغرب کو ہٹا کر اسلامی آئین وقانون کے مطابق ایک جدید ریاست کا نظام بنا اور چلا سکے۔

یہ واقعی ایک سخت پیچیدگی ہے جس نے تمام مسلم ممالک میں اسلامی قانون و دستور کے نفاذ کو مشکل بنا رکھا ہے۔ مگر ہمارا معاملہ دوسرے مسلمان ملکوں سے بالکل مختلف ہے۔ ہم اس برعظیم ہند میں پچھلے دس سال سے اس بات پر لڑتے رہے ہیں کہ ہم اپنی ایک مستقل تہذیب، الگ نظریۂ زندگی اور مخصوص آئینِ حیات رکھتے ہیں، ہمارے لئے مُسلم وغیر مسلم کی ایک ایسی متحدہ قومیت ناقابل قبول ہے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۰) تسلط کے بعد بھی ایک مدت تک شریعت ہی کو قانون کی حیثیت حاصل تھی، چنانچہ ۱۷۹۱ء تک اس مُلک میں چور کا ہاتھ کاٹا جاتا رہا مگر اس کے بعد انگریزی حکومت نے بتدریج اسلامی قوانین کو دوسرے قوانین سے بدلنا شروع کیا یہاں تک کہ انیسویں صدی کے وسط تک پہنچتے پہنچتے پوری شریعت منسوخ ہوگئی اور اس کا صرف وہ حصہ مسلمانوں کے پرسنل لا کی حیثیت سے باقی رہنے دیا گیا جو نکاح و طلاق وغیرہ مسائل سے متعلق تھا۔ پھر اسی نقش قدم پر خود وہ ممالک بھی چل پڑے جہاں مسلمانوں کی اپنی حکومتیں قائم تھیں۔ ہندوستان کی تمام مسلمان ریاستوں نے رفتہ رفتہ اپنے پبلک لا کو برطانوی ہند کے نمونے پر ڈھال لیا اور شریعت کو صرف پرسنل لا میں محدود کر دیا۔ مصری حکومت نے ۱۸۸۳ء میں اپنے پورے قانونی نظام کو فرینچ کوڈ کے مطابق بدل لیا اور محض نکاح و طلاق اور وراثت وغیرہ کے مسائل قاضیوں کے دائرۂ اختیار میں چھوڑ دئے۔ اس کے بعد بیسویں صدی میں البانیا اور ٹرکی نے ایک قدم اور بڑھایا۔ انھوں نے صاف صاف اعلان کیا کہ ان کی حکومتیں بے دین حکومتیں ہیں، اور صرف اتنے ہی پر اکتفا نہ کیا کہ اپنے ملکی قوانین اٹلی، سوئٹزرلینڈ، فرانس اور جرمنی کے نمونوں پر ڈھال لئے، بلکہ مسلمانوں کے پرسنل لا میں بھی وہ کھلی کھلی تحریفات کر ڈالیں جن کی جرأت کوئی غیر مُسلم حکومت بھی نہ کر سکی تھی۔ چنانچہ البانیا میں تعدد ازدواج کو قانوناً ممنوع ٹھیرایا گیا۔ اور ٹرکی میں نکاح، طلاق اور وراثت کے متعلق قرآن کے صریح احکام تک تبدیل کر ڈالے گئے۔ اب صرف افغانستان (باقی صفحہ ۴۲ پر)

جس کا نظام زندگی لامحالہ ہمارے آئینِ حیات سے مختلف ہوگا، ہمیں ایک الگ خطۂ زمین درکار ہے جس میں ہم اپنے آئین پر زندگی کا نظام بنا اور چلا سکیں۔ ایک طویل اور ان تھک کشمکش کے بعد بالآخر اب ہمیں وہ خطۂ زمین مل گیا ہے جس کا ہم مطالبہ کر رہے تھے، اور اس کی قیمت میں ہم کو لاکھوں مسلمانوں کی جان، مال اور آبرو دینی پڑی ہے۔ یہ سب کچھ ہو چکنے کے بعد اگر ہم نے یہاں اپنا وہ آئینِ حیات ہی نافذ نہ کیا جس کے لئے اتنے پاپڑ بیل کر اور اتنی بھاری قیمت ادا کر کے یہ خطۂ زمین حاصل کیا گیا ہے تو ہم سے بڑھ کر زیاں کار کوئی نہ ہوگا۔ اسلامی دستور کے بجائے جمہوری لادینی دستور، اور اسلامی قانون کی جگہ تعزیراتِ ہند اور ضابطۂ دیوانی ہی جاری کرنا تھا تو آخر ہندوستان کیا بُرا تھا کہ اتنے لڑائی جھگڑوں سے یہ پاکستان لیا جاتا۔ اور اگر ہمارا مقصد اشتراکی پروگرام نافذ کرنا تھا تو یہ "کارِ خیر" بھی ہندوستان کی سوشلسٹ یا کمیونسٹ پارٹی کے ساتھ مل کر انجام دیا جا سکتا تھا، اس کے لئے بھی کوئی ضرورت نہ تھی کہ خواہ مخواہ اتنی جانفشانی اور اتنی بڑی قیمت پر پاکستان حاصل کرنے کی حماقت کی جاتی۔ دراصل ہم ایک قوم کی حیثیت سے اپنے آپ کو خدا اور خلق اور تاریخ کے سامنے آئینِ اسلامی کے نفاذ کے لئے پابند کر چکے ہیں، ہمارے لئے اب اپنے قول سے پھرنا ممکن نہیں رہا ہے۔ لہٰذا چاہے دوسری مسلمان قومیں کچھ کرتی رہیں، ہمیں بہرحال ان ساری پیچیدگیوں کو حل کرنا ہی پڑیگا جو اس کام کی راہ میں حائل ہیں۔

جہاں تک اسلامی قانون کے نفاذ کی عملی مشکلات کا تعلق ہے ان سب کو دور کرنے کی تدبیریں کی جا سکتی ہیں۔ ان میں سے کوئی بھی اصلی مشکل نہیں ہے۔ اصلی مشکل صرف یہ ہے کہ وہ دماغ جن کی فکر و محنت اس کام کے لئے درکار ہے، بجائے خود مطمئن نہیں ہیں، اور ان کے عدمِ اطمینان کی وجہ ان کی عدمِ واقفیت ہے۔ اس لئے سب سے پہلے جو کام کرنے کا ہے وہ یہی ہے کہ انہیں واضح طریقہ پر یہ بتایا جائے کہ اسلامی قانون کس چیز کا نام ہے، اس کی حقیقت کیا ہے، اس کا مقصد اور اس کے اصول، اس کی روح اور اس کا مزاج کیا ہے، اس میں کیا چیز قطعی اور مستقل ہے اور اس کے ایسا ہونے کا فائدہ

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۴) اور سعودی عرب ہی وہ ملک دنیا میں ایسے رہ گئے ہیں جہاں شریعت کو ملکی قانون کی حیثیت حاصل ہے، اگرچہ شریعت کی روح وہاں سے بھی غائب ہے۔

گیا ہے، اور اس میں کونسی چیز ابد تک ترقی پذیر ہے اور وہ کس طرح ہر دور میں ہماری بڑھتی ہوئی تمدنی ضرورتوں کو پورا کر سکتی ہے، اس کے احکام کن مصالح پر مبنی ہیں اور ان غلط فہمیوں کی کیا اصلیت ہے جو ان احکام کے متعلق ناواقف لوگوں میں پھیلی ہوئی ہیں۔ اگر یہ تفہیم صحیح طریقہ پر ہو جائے تو ہمیں یقین ہے کہ ہمارے بہترین کار فرما اور کارکن دماغ مطمئن ہو جائینگے اور ان کا اطمینان اُن ساری تدبیروں کا دروازہ کھول دیگا جو اسلامی قانون کے نفاذ کو عملاً ممکن بنا سکتی ہیں ـــــ میری آج کی تقریر اسی تعارف کے لئے ہے۔

قانون اور نظام زندگی کا باہمی تعلق

قانون کے لفظ سے ہم جس چیز کو تعبیر کرتے ہیں وہ دراصل اس سوال کا جواب ہے کہ انسانی طرز عمل، انفرادی اور اجتماعی طور پر کیا ہونا چاہیئے۔ اس سوال کا دائرہ اُس دائرہ سے بہت زیادہ وسیع ہے جس میں قانون اس کا جواب دیتا ہے۔ ہم کو بہت وسیع پیمانے پر اس "ہونا چاہیئے" کے سوال سے سابقہ پیش آتا ہے اور اس کے بے شمار جوابات ہیں جو مختلف عنوانات کے تحت مرتب ہوتے ہیں۔ ان کا ایک مجموعہ ہماری اخلاقی تعلیم و تربیت میں شامل ہوتا ہے اور اسی کے مطابق ہم اپنے افراد کی سیرت و کردار کو ڈھالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کا ایک دوسرا مجموعہ ہمارے معاشرتی نظام میں داخل ہوتا ہے اور اسی کے لحاظ سے ہم اپنی معاشرت میں مختلف قسم کے انسانی تعلقات کو منضبط کرتے ہیں۔ ان کا ایک تیسرا مجموعہ ہمارے معاشی نظام میں جگہ پاتا ہے اور اسی کی روشنی میں ہم دولت اور اس کی پیدائش اور اس کی تقسیم اور اس کے تبادلے اور اس پر لوگوں کے حقوق کا ضابطہ بناتے ہیں۔ غرض اسی طریقے پر ان جوابات کے بہت سے مجموعے بن جاتے ہیں جو ہماری زندگی کے مختلف شعبوں کی تشکیل اور اُن کے ضوابط عمل معین کرتے ہیں۔ اور قانون ان بہت سے مجموعوں میں سے صرف اُن جوابات پر مشتمل ہوتا ہے جن کو نافذ کرنے کے لئے سیاسی اقتدار استعمال کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اب اگر کوئی شخص کسی قانون کو سمجھنا چاہے تو یہ کافی نہیں ہے کہ وہ اپنی تحقیقات کو صرف اسی دائرے پر منحصر کر دے جس میں قانون نے اس "ہونا چاہیئے" کے سوال کا جواب دیا ہے، بلکہ اسے سوسائٹی کی اُس پوری اسکیم کو سمجھنے کی کوشش

کرنی ہوگی جس میں زندگی کے ہر شعبے کے متعلق اس سوال کا جواب دیا گیا ہے۔ اس لئے کہ قانون اسی اسکیم کا ایک جزو ہے، اور اس جزء کے مزاج کو سمجھنا، یا اس کے متعلق کوئی رائے قائم کرنا بغیر اس کے ممکن نہیں ہے کہ کل کو سمجھا جائے۔

نظام زندگی کی فکری اور اخلاقی بنیادیں

پھر زندگی کے پورے دائرے میں ہم "کیا ہونا چاہیئے" کے سوال کا جو جواب دیتے ہیں وہ دراصل ایک دوسرے سوال یعنی "کیوں ہونا چاہیئے" کے جواب سے ماخوذ ہوتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں یوں سمجھئے کہ "کیا ہونا چاہیئے" کے متعلق ہمارے تمام جوابات دراصل اُن نظریات پر مبنی ہوتے ہیں جو ہم نے انسانی زندگی اور اس کے خیر و شر اور اس کے حق و باطل اور صحیح و غلط کے بارے میں قائم یا اختیار کئے ہیں، اور ان نظریات کی نوعیت متعین کرنے میں اس ماخذ یا مآخذ کا بہت بڑا دخل، بلکہ اصلی فیصلہ کُن اثر ہوتا ہے جہاں سے ہم نے ان نظریات کو اخذ کیا ہے۔ دُنیا میں مختلف انسانی گروہوں کے قوانین کا اختلاف اسی وجہ سے ہے کہ انسانی زندگی کے متعلق ان کے نظریات ایک ماخذ سے لئے ہوئے نہیں ہیں بلکہ ان کے مآخذ ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ اس اختلاف کے باعث ان کے نظریے مختلف ہوئے، ان کے اختلاف نے زندگی کی اسکیمیں مختلف کر دیں، اور پھر ان سکیموں کے جو حصے قانون سے متعلق ہیں وہ بھی لازماً مختلف ہو کر رہے۔ اب یہ کیسے ممکن ہے کہ ہم زندگی کی کسی خاص اسکیم کے بنیادی نظریات اور ان کے مآخذ اور ان سے وجود میں آنے والے پورے نظامِ حیات کو سمجھے بغیر صرف اس کے قانونی حصہ کے متعلق کوئی رائے قائم کر سکیں اور وہ بھی اس قانونی حصہ کا تفصیلی مطالعہ کر کے نہیں بلکہ اس کے بعض پہلوؤں کے بارے میں چند اُڑتی ہوئی خبریں سُن کر!

میں یہاں تقابلی مطالعے (Comparative Study) کا ارادہ نہیں رکھتا۔ اگرچہ بات پوری طرح تو اسی وقت سمجھ میں آسکتی ہے جب مغربی نظام زندگی کو، جس کا قانون آپ پڑھتے اور اپنے ملک میں جاری کرتے ہیں، اسلامی نظام زندگی کے بالمقابل رکھ کر دیکھا جائے کہ ان کے درمیان کیا اختلاف ہے اور اس اختلاف نے کیوں ان کے قوانین کو مختلف کر دیا ہے۔ لیکن اس

بحث سے گفتگو بہت طویل ہو جائیگی، اس لئے میں صرف اسلامی نظامِ زندگی کی تشریح پر اکتفا کرونگا۔

اسلامی نظامِ زندگی کا ماخذ

اسلام جس نظامِ زندگی کا نام ہے اس کا ماخذ ایک کتاب ہے جس کے مختلف اڈیشن قدیم ترین زمانے سے، توراۃ، انجیل، زبور وغیرہ بہت سے ناموں کے ساتھ دُنیا میں شایع ہوتے رہے اور آخری اڈیشن قرآن کے نام سے انسانیت کے سامنے پیش کیا گیا۔ اس کتاب کا اصل نام اسلام کی اصطلاح میں الکتاب (The Book) ہے اور یہ دوسرے نام دراصل اس کے اڈیشنوں کے نام ہیں۔ اس کا دوسرا ماخذ وہ لوگ ہیں جو مختلف زمانوں میں اس الکتاب کو لیکر آئے اور جنھوں نے اپنے قول اور عمل سے اس کے منشا کی ترجمانی کی۔ یہ لوگ اگرچہ الگ الگ اشخاص ہونے کی حیثیت سے نوح، ابراہیم، موسیٰ، عیسیٰ اور محمد (علیہم الصلوٰۃ والسلام اجمعین) وغیرہ ناموں سے موسوم ہیں، لیکن اس بناء پر کہ یہ ایک گروہ کے اشخاص ہیں جو ایک ہی مشن لیکر اُٹھے ان سب کو ایک جامع نام الرسول سے موسوم کرنا بالکل صحیح ہے۔

اسلام کا نظریۂ زندگی

اس الکتاب اور الرسول نے زندگی کا جو نظریہ پیش کیا ہے وہ یہ ہے کہ یہ عظیم الشان کائنات جو تمہیں صریحاً ایک زبردست نظام میں جکڑی ہوئی اور ایک مقرر قانون پر چلتی ہوئی نظر آرہی ہے، دراصل ایک خدا کی حکومت ہے۔ خدا ہی اس کا خالق ہے، وہی اس کا مالک ہے، اور وہی اس کا فرمانروا ہے۔ یہ زمین جس پر تم رہتے ہو، اس کی بے پایان سلطنت کے لاتعداد صوبوں میں سے ایک چھوٹا سا صوبہ ہے اور یہ صوبہ بھی مرکزی اقتدار کی اس گرفت میں پوری طرح جکڑا ہوا ہے جس میں اس جہان ہست و بود کا ہر حصّہ جکڑا ہوا ہے۔ تم اس صوبے میں خدا کی پیدائشی رعیّت (Born Subject) ہو، تم اپنے خالق آپ نہیں ہو بلکہ اس کی مخلوق ہو۔ اپنے پروردگار آپ نہیں ہو بلکہ اس کے پروردہ ہو۔ اپنے بل پر آپ نہیں جی رہے ہو بلکہ اس کے جلائے جی رہے ہو۔ اس لئے تمہارے ذہن میں اپنی خود مختاری کا اگر

کوئی زعم ہے تو وہ ایک غلط فہمی اور نظر کے ایک دھوکے سے بڑھ کر کچھ نہیں۔ اپنی زندگی کے ایک بہت بڑے حصہ میں تو تم صریح طور پر رعیت ہو اور اپنی محکومی کو خود جانتے ہو۔ اپنی ماؤں کے پیٹوں میں استقرارِ حمل سے لیکر اپنی موت کی آخری ساعت تک تم خدا کے قانونِ طبعی (Laws of Nature) سے اس طرح بندھے ہوئے ہو کہ ایک سانس تک اس کے خلاف نہیں لے سکتے، اور تمہارے اوپر فطرت کی قوتیں اور قوانین اس طرح حاوی ہیں کہ تم جو کچھ کر سکتے ہو اُن کے تحت رہ کر ہی کر سکتے ہو، ایک لمحہ کے لئے بھی تمہارا ان سے آزاد ہو جانا ممکن نہیں ہے۔ اب رہ گیا تمہاری زندگی کا اختیاری حصہ جس میں تم اپنے اندر ارادے کی آزادی محسوس کرتے ہو اور اپنی پسند کے مطابق انفرادی و اجتماعی عمل کی راہیں انتخاب کرنے کی طاقت پاتے ہو، تو بلاشبہ تمہیں اس حد تک آزادی حاصل ہے، مگر یہ آزادی تمہیں فرمانروائے کائنات کی رعیت ہونے سے خارج نہیں کر دیتی بلکہ صرف یہ اختیار دیتی ہے کہ چاہو تو اطاعت کا رویہ اختیار کرو جو پیدائشی رعیت ہونے کی حیثیت سے تمہیں اختیار کرنا چاہیئے، اور چاہو تو خود مختاری و بغاوت کا رویہ اختیار کرو جو اپنی فطری حقیقت کے اعتبار سے تمہیں نہ اختیار کرنا چاہیئے۔

حق کا بنیادی تصور

یہاں سے حق کا سوال پیدا ہوتا ہے اور یہ اولین بنیادی حق کا سوال ہے جو تمام چھوٹے سے چھوٹے جزوی معاملات تک حق اور باطل کے فیصلے پر اثر انداز ہوتا ہے۔ زندگی کی حقیقت کا جو نظریہ الکتاب اور الرسول نے پیش کیا ہے اس کو بطور ایک امر واقعہ (Fact) کے تسلیم کر لینے کے بعد یہ بات صریح طور پر حق قرار پا جاتی ہے کہ آدمی اپنی زندگی کے اختیاری حصہ میں بھی اسی خدا کی حاکمیت (Sovereignty) تسلیم کرے جو اس کی زندگی کے پورے غیر اختیاری حصہ کا اور اُس تمام کائنات کا جس میں یہ زندگی بسر ہو رہی ہے، آپ سے آپ حاکم (Sovereign) ہے۔ یہ چیز کئی وجوہ سے حق ہے۔ یہ اس لئے بھی حق ہے کہ انسان جن قوتوں اور جن جسمانی آلات سے اپنے اختیارات کو استعمال کرتا ہے وہ خدا کا عطیہ ہیں۔ اس لئے بھی حق ہے، کہ خود یہ اختیارات انسان کے اپنے حاصل کردہ نہیں ہیں بلکہ تفویض کردہ (Delegated) ہیں۔

اس لئے بھی حق ہے کہ جن چیزوں پر یہ اختیارات استعمال کئے جاتے ہیں وہ سب خدا کی مِلک ہیں۔ اس لئے بھی حق ہے کہ جس مُلک میں استعمال کئے جاتے ہیں وہ خدا کا ملک ہے۔ اور اس لئے بھی حق ہے کہ عالمِ کائنات اور حیاتِ انسانی کی ہمواری (Harmony) کا تقاضا یہی ہے کہ ہماری زندگی کے اختیاری اور غیر اختیاری، دونوں حصّوں کا حاکم اور سرچشمۂ احکام ایک ہی ہو۔ اِن دو حصوں کے دو الگ اور ایک دوسرے سے مختلف قبلے بن جانے سے ایسا تضاد پیدا ہو جاتا ہے جو موجب فساد ہو کر رہتا ہے۔ ایک شخص کی زندگی میں تو اس چیز کا فساد محدود پیمانے پر ہی ظاہر ہوتا ہے مگر بڑی بڑی قوموں کی زندگی میں اس کے بُرے نتائج اتنے بڑے پیمانے پر نکلتے ہیں کہ خشکی اور تری اور ہوا فساد سے بھر جاتی ہے۔

"اسلام" اور "مُسلم" کے معنی الکتاب اور الرسول انسان کے سامنے اس حق کو پیش کرتے ہیں اور اس کو دعوت دیتے ہیں کہ کسی دباؤ کے بغیر وہ اپنی خوشی سے اس کو قبول کرلے۔ چونکہ یہ انسانی زندگی کے اس حصّے کا معاملہ ہے جس میں خُدا نے انسان کو خود اختیار دیا ہے اس لئے یہ بات کہ انسان اس حصّے میں خدا کو اپنا حاکم مانے، کسی دباؤ سے نہیں منوائی جاتی بلکہ برضا و رغبت تسلیم کرائی جاتی ہے۔ جس کا اطمینان بھی اس بیانِ واقعہ (statement of Fact) پر ہو جائے جو الکتاب اور الرسول نے کائنات کی حقیقت کے متعلق دیا ہے، اور جس کا ضمیر بھی اس امر کی گواہی دے کہ اس واقعی حقیقت کی موجودگی میں حق وہی ہے جو منطقی نتیجہ کے طور پر اس سے نکلتا ہے، وہ اپنی مرضی سے اپنی آزادی و خود مختاری خدا کی حاکمیت کے آگے تسلیم (Surrender) کر دے۔ اسی تسلیم کا نام اسلام ہے، اور جو لوگ تسلیم کا یہ فعل کریں وہ "مسلم" کہلاتے ہیں، یعنی ایسے لوگ جنھوں نے خدا کی حاکمیت مان لی، اپنی خود مختاری سے اُس کے حق میں دست بردار ہو گئے، اور اس بات کو انھوں نے خود اپنے اوپر لازم کرلیا کہ اپنی زندگی کا نظام خدا کے احکام کے مطابق چلائیں گے۔

مسلم سوسائٹی کی حقیقت اب ایسے تمام لوگ جنھوں نے تسلیم کا یہ فعل کیا ہو ایک وحدت میں منسلک کئے جاتے ہیں اور ان کے اجتماع سے "مسلم" سوسائٹی کی تشکیل و تنظیم

ہوتی ہے۔ یہ سوسائٹی اُن سوسائٹیوں سے بالکل مختلف ہے جو اتفاقی حوادث کے نتیجہ میں بنتی ہیں۔ اس کی تشکیل ایک ارادی فعل سے ہوتی ہے۔ اور اس کی تنظیم ایک ایسے معاہدے Contract کے ذریعہ سے عمل میں آتی ہے جو خدا اور بندوں کے درمیان شعوری طور پر واقع ہوتا ہے۔ اس معاہدے میں بندے یہ تسلیم کرتے ہیں کہ خدا اُن کا حاکم ہے، اسی کی ہدایت اُن کے لئے دستور زندگی ہے، اسی کے احکام ان کے لئے قانون ہیں، وہ اسی کو خیر مانیں گے جسے خدا خیر بتائیگا اور اسی کو شر تسلیم کرینگے جسے خدا شر کہے گا، صحیح اور غلط اور جائز و ناجائز کا معیار وہ خدا ہی سے لینگے، اور اپنی آزادی کو اُن حدود کے اندر محدود رکھینگے جو خدا اُن کے لئے کھینچ دیگا۔ مختصر یہ کہ اس معاہدے کی بنیاد پر جو سوسائٹی بنتی ہے وہ واضح طور پر یہ اقرار کرتی ہے کہ وہ اپنے معاملاتِ زندگی میں "کیا ہونا چاہیئے" کا جواب خود تجویز نہیں کریگی بلکہ اُس جواب کو قبول کریگی جو خُدا کی طرف سے ملیگا۔

اس واضح اقرار کی بنیاد پر جب ایک سوسائٹی بن جاتی ہے تو الکتاب اور الرسول اُسے ایک ضابطۂ زندگی دیتے ہیں جو "شریعت" کہلاتا ہے، اور سوسائٹی پر خود اپنے ہی اقرار کی وجہ سے یہ لازم ہوجاتا ہے کہ اپنے معاملات زندگی کی اُس اسکیم کے مطابق چلائے جو اس شریعت میں تجویز کی گئی ہے۔ تاوقتیکہ کسی شخص کی عقل بالکل ہی خبط نہ ہوگئی ہو، وہ کسی طرح اس بات کو ممکن فرض نہیں کرسکتا کہ کوئی مسلم سوسائٹی اپنے بنیادی معاہدے کو توڑے بغیر شریعت کے سوا کوئی دوسرا ضابطۂ زندگی اختیار کرسکتی ہے۔ دوسرا ضابطہ اختیار کرنے کے ساتھ ہی معاہدہ خود بخود ٹوٹ جاتا ہے۔ اور اس کے ٹوٹتے ہی وہ سوسائٹی "مسلم" کے بجائے غیر مسلم بن جاتی ہے۔ اتفاقی طور پر کسی شخص کا اپنی زندگی کے کسی معاملہ میں شریعت کی خلاف ورزی کر بیٹھنا اور چیز ہے۔ اس سے معاہدہ ٹوٹتا نہیں ہے بلکہ صرف ایک جرم کا ارتکاب ہوتا ہے۔ لیکن اگر ایک پوری سوسائٹی جان بوجھ کر یہ طے کرلے کہ شریعت اب اُس کا ضابطۂ حیات نہیں ہے، اور یہ کہ اپنا ضابطہ اب وہ خود تجویز کریگی، یا کسی دوسرے ماخذ سے لے گی، تو یقیناً یہ ایک فسخ معاہدہ کا فعل ہے اور قطعاً کوئی وجہ نہیں کہ ایسی سوسائٹی پر لفظ "مسلم" کا اطلاق درست ہو۔

شریعت کا مقصد اور اُس کے اصول ان بنیادی امور کی توضیح کے بعد اب ہمیں اس اسکیم کو سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیئے جو انسانی زندگی کے لئے شریعت نے تجویز کی ہے۔ اس غرض کے لئے یہ مناسب ہوگا کہ ہم پہلے اس کے مقصد اور اس کے بڑے بڑے اصولوں کا جائزہ لے لیں۔

اُس کا مقصد انسانی زندگی کے نظام کو معروفات پر قائم کرنا اور منکرات سے پاک کرنا ہے معروفات سے مراد وہ نیکیاں، خوبیاں اور بھلائیاں ہیں جن کو انسانی فطرت ہمیشہ سے بھلائی کی حیثیت سے جانتی ہے۔ اور منکرات سے مراد وہ برائیاں ہیں جن کو ہمیشہ سے انسانیت کا ضمیر برا جانتا آیا ہے۔ دوسرے الفاظ میں معروف فطرتِ انسانی سے مناسبت رکھنے والی چیز ہے۔ اور منکر اس کے خلاف ہے۔

وہ ہمارے لئے اُنہی چیزوں کو بھلائی قرار دیتی ہے جو خدا کی بنائی ہوئی فطرت کے مطابق ہیں اور اُنہی چیزوں کو بُرا قرار دیتی ہے جو اس فطرت سے موافقت نہیں رکھتیں۔ وہ ان بھلائیوں اور برائیوں کی محض ایک فہرست ہی بنا کر ہمارے حوالہ کردینے پر اکتفا نہیں کرتی بلکہ زندگی کی پوری اسکیم ایسے نقشے پر بناتی ہے کہ اس کی بنیادیں معروف بھلائیوں پر قائم ہوں اور معروفات اس میں پروان چڑھ سکیں، اور منکرات کو اس کی تعمیر میں شامل ہونے سے روکا جائے اور نظام زندگی میں ان کے در آنے اور اُن کا زہر پھیلنے کے مواقع باقی نہ رہنے دئے جائیں۔

اس غرض کے لئے وہ معروفات کے ساتھ اُن اسباب اور ذرائع کو بھی اپنی اسکیم میں شامل کرتی ہے جن سے وہ قائم ہو سکتے اور پروان چڑھ سکتے ہیں، اور اُن موانع کو ہٹانے کا انتظام بھی تجویز کرتی ہے جو معروفات کے قیام اور نشو و نما میں کسی طور پر سدِّ راہ ہو سکتے ہوں۔ اس طرح اصل معروفات کے ساتھ ان کے وسائلِ قیام و ترقی بھی معروف میں شمار ہو جاتے ہیں اور ان کے موانع منکرات کی فہرست میں شامل کردئے جاتے ہیں۔ یہی معاملہ منکرات کے ساتھ بھی ہے۔ اصل منکرات کے ساتھ وہ چیزیں بھی منکر قرار پاتی ہیں جو کسی منکر کے وقوع، یا ظہور، یا نشو و نما کا ذریعہ بنیں یا سوسائٹی کے

پورے نظام کو شریعت اس طرز پر ڈھالتی ہے کہ ایک ایک معروف اپنی پوری صورت میں قائم ہو، زندگی کے تمام متعلق شعبوں میں اس کا ظہور ہو، ہر طرف سے اس کو قائم ہونے اور پروان چڑھنے میں مدد ملے، اور ہر وہ رکاوٹ دور کی جائے جو کسی طرح سے اس کی راہ میں حائل ہو سکتی ہو۔ اسی طرح ایک ایک منکر کو چن چن کر زندگی سے نکالا جائے، اس کی پیدائش اور نشو و نما کے اسباب روکے جائیں، جدھر جدھر سے وہ زندگی میں گھس سکتا ہے اس کا راستہ بند کیا جائے اور اگر وہ سر اٹھا ہی لے تو پھر سختی کے ساتھ اسے دبا دیا جائے۔

معروفات کو شریعت تین قسموں پر تقسیم کرتی ہے۔ ایک واجب یا فرض۔ دوسرے مندوب یعنی مطلوب۔ تیسرے مباح یعنی جائز۔

فرض و واجب وہ معروفات ہیں جو مسلم سوسائٹی پر لازم کئے گئے ہیں۔ ان کے متعلق شریعت صاف صاف اور قطعی احکام دیتی ہے۔

مطلوب وہ معروفات ہیں جن کو شریعت چاہتی ہے یا پسند کرتی ہے کہ وہ سوسائٹی میں قائم اور جاری ہوں۔ ان میں سے بعض کو صاف الفاظ میں بیان کیا گیا ہے اور بعض کا اشارہ شارع کے ارشادات سے نکلتا ہے۔ بعض کے قیام و نشو و نما کا بندوبست کیا گیا ہے اور بعض کی صرف سفارش کی گئی ہے تاکہ سوسائٹی بحیثیت مجموعی یا اس کے صالح لوگ ان کی طرف خود توجہ کریں۔

رہے مباح معروفات، تو شریعت کی زبان میں ہر وہ چیز اور فعل مباح ہے جس کی ممانعت نہ کی گئی ہو۔ اس تعریف کی بنا پر مباحات صرف وہی نہیں ہیں جن کی اجازت کی تصریح ہو، یا جن کے معاملہ میں بصیغۂ صاف طور پر اختیار دیا گیا ہو، بلکہ ان کا دائرہ بہت وسیع ہو جاتا ہے، حتیٰ کہ چند بیان کردہ ممنوعات کو چھوڑ کر دنیا میں سب کچھ مباح ٹھیرتا ہے۔ یہی مباحات کا دائرہ وہ دائرہ ہے جس میں شریعت نے ہم کو آزادیٔ عمل دی ہے، اور اسی دائرہ میں ہم کو اپنی ضرورتوں کے مطابق قوانین، ضوابط اور طریق کار خود تجویز کر لینے کے اختیارات حاصل ہیں۔

منکرات کو شریعت میں دو قسموں پر تقسیم کیا گیا ہے۔ ایک حرام، یعنی قطعی ممنوع۔ دوسرے مکروہ یعنی

ناپسندیدہ۔ حرام وہ ہے جس سے باز رہنا اور اپنی انفرادی واجتماعی زندگی کو اس سے پاک رکھنا مسلمانوں پر لازم کر دیا گیا ہے، اور شریعت میں اس کے متعلق صاف صاف احکام دیدئے گئے ہیں۔ رہا مکروہ تو اس کے متعلق شارع کسی نہ کسی طور پر صراحتہً یا کنایتہً ناپسندیدگی کا اظہار کرتا ہے جس سے بآسانی معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ کس درجہ میں ناپسندیدہ ہے۔ بعض مکروہات حرام کے قریب ہیں اور بعض مباح کی سرحد سے ملے ہوئے ہیں اور بہت سے ان کے درمیانی مراتب پر ہیں۔ بعض کو روکنے اور بند کرنے کا شریعت کے نظام میں بندوبست کیا گیا ہے اور بعض کو ناپسندیدہ بتا کر چھوڑ دیا گیا ہے تاکہ سوسائٹی خود یا اس کے صالح عناصر ان کا سد باب کریں۔

شریعت کی ہمہ گیری

معروف اور منکر کے متعلق یہ احکام ہماری انفرادی اور اجتماعی زندگی کے تمام گوشوں میں پھیلے ہوئے ہیں۔ مذہبی عبادات، شخصی کردار، اخلاق اور عادات، کھانا پینا، پہننا اوڑھنا، نشست و برخاست، بات چیت، خاندانی زندگی، معاشرتی تعلقات، معاشی معاملات، ملکی انتظام، شہریت کے حقوق و فرائض، قیام عدل کا نظام، حکومت کے طریقے، صلح و جنگ اور دوسری قوموں کے ساتھ تعلقات، غرض زندگی کا کوئی شعبہ اور پہلو ایسا نہیں رہ گیا ہے جس کے متعلق شریعت نے ہم پر نیکی اور بدی کے طریقے، بھلائی اور برائی کے راستے، اور پاک و ناپاک کے امتیازات واضح نہ کر دئے ہوں۔ وہ ہمیں ایک صالح نظام زندگی کا پورا نقشہ دیتی ہے جس میں صاف صاف بتا دیا گیا ہے کہ کیا بھلائیاں ہیں جنہیں ہم کو قائم کرنا، بڑھانا اور نشوونما دینا ہے، کیا برائیاں ہیں جن کو دبانا اور مٹانا ہے، کن حدود کے اندر ہماری آزادی عمل کو محدود رہنا چاہیئے اور عملاً ہمیں کونسے طریقے اختیار کرنے چاہئیں جن سے ہماری زندگی میں مطلوبہ بھلائیاں پروان چڑھیں اور برائیوں کا استیصال ہو۔

نظام شریعت کا ناقابل تقسیم ہونا

یہ پورا نقشۂ زندگی ایک ہی نقشۂ زندگی ہے اور اس کا ایک مجموعی مزاج ہے جو تقسیم ہو کر قائم نہیں رہ سکتا۔ اس کی وحدت کچھ اسی طرح کی ہے جیسی خود انسان کے وجود کی وحدت ہے۔ آپ جس چیز کو انسان کہتے ہیں وہ آدمی کا سالم وجود ہے، نہ کہ انسانی جسم کے الگ الگ کئے ہوئے ٹکڑوں کا مجموعہ۔ ایک کٹی ہوئی ٹانگ کو آپ ۱/۲ انسان یا ۱/۲ انسان

نہیں کہہ سکتے۔ نہ یہ کٹی ہوئی ٹانگ ان خدمات میں سے کوئی خدمت انجام دے سکتی ہے جو زندہ اور سالم جسم کا ایک عضو ہونے کی صورت میں وہ انجام دیا کرتی ہے، نہ اس ٹانگ کو کسی اور جانور کے جسم میں لگا کر آپ یہ توقع کر سکتے ہیں کہ اس جانور میں ایک ٹانگ کے بقدر انسانیت پیدا ہو جائیگی، اور نہ انسانی جسم کے ہاتھ، پاؤں، آنکھ، ناک وغیرہ کو الگ الگ لے کر آپ ان کے حسن یا ان کے فائدے کے متعلق کوئی رائے قائم کر سکتے ہیں جب تک کہ پورے زندہ جسم میں ان کے تناسب اور اُن کے عمل کو نہ دیکھیں۔ ٹھیک یہی حال شریعت کے نقشۂ زندگی کا بھی ہے۔ اسلام اس پورے نقشے کا نام ہے نہ کہ اس کے جُدا جُدا ٹکڑوں کا۔ اس کے اجزاء کو پارہ پارہ کر کے نہ تو ان کے بارے میں جدا گانہ رائے زنی کرنا درست ہو سکتا ہے، نہ مجموعہ سے الگ ہو کر اس کا کوئی جزو وہ کام کر سکتا ہے جو وہ صرف اپنے مجموعہ ہی میں رہ کر کیا کرتا ہے، نہ کسی دوسرے نظامِ زندگی میں اس کے کسی جزو یا اجزاء کو پیوست کر کے کوئی مفید نتیجہ حاصل کیا جا سکتا ہے۔ شارع نے یہ نقشہ اس لئے بنایا ہے کہ یہ پورا کا پورا ایک ساتھ قائم ہو نہ اس لئے کہ آپ حسب منشا اس کے جس جزو کو جب چاہیں لیکر قائم کر دیں بغیر اس کے کہ دوسرے اجزاء اس کے ساتھ ہوں۔ اس کا ہر جزو دوسرے اجزاء کے ساتھ اس طرح جڑا ہوا ہے کہ ان کے ساتھ مل کر ہی وہ کام کر سکتا ہے اور آپ اس کی خوبی کے متعلق صحیح رائے صرف اسی وقت قائم کر سکتے ہیں جبکہ پورے نظامِ اسلامی کے تناسب اور عمل میں اس کو کام کرتے ہوئے دیکھیں۔

آج شریعت کے بعض احکام کے متعلق جو غلط فہمیاں لوگوں میں پائی جاتی ہیں ان میں سے اکثر کی وجہ یہی ہے کہ پورے اسلام پر مجموعی نگاہ ڈالے بغیر اس کے کسی ایک جزو کو نکال لیا جاتا ہے، اور پھر یا تو اسے موجودہ غیر اسلامی نظامِ زندگی کے اندر رکھکر رائے قائم کرنے کی کوشش کی جاتی ہے یا پھر بجائے خود اسی جزو کو ایک مستقل چیز سمجھ کر اس کے حُسن و قبح کا فیصلہ کیا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر اسلامی قانونِ فوجداری کی بعض دفعات پر آج کے لوگ بہت ناک بھوں چڑھاتے ہیں، لیکن انھیں یہ معلوم نہیں ہے کہ جس نقشۂ زندگی میں یہ قانونی دفعات رکھی گئی ہیں اس کے اندر ان کے ساتھ ایک نظامِ معیشت، ایک نظامِ معاشرت، ایک نظامِ حکومت اور ایک نظامِ تعلیم و تربیت بھی ہے جو اگر ساتھ ساتھ پوری

اجتماعی زندگی میں کام نہ کر رہا ہو، تو محض ان دفعات کو قانون کی کتاب سے نکال کر عدالت کے کمرے میں جاری کر دینا خود اس نقشۂ زندگی کے بھی خلاف ہے۔ بلاشبہ اسلامی قانون چوری پر ہاتھ کاٹنے کی سزا دیتا ہے، مگر یہ حکم ہر سوسائٹی میں جاری ہونے کے لئے نہیں دیا گیا ہے، بلکہ اسے اسلام ہی کی اُس سوسائٹی میں جاری کرنا مقصود تھا جس کے مالداروں سے زکوٰۃ لی جا رہی ہو جس کا بیت المال ہر حاجت مند کی امداد کے لئے کھلا ہو، جس کی ہر بستی پر مسافروں کی تین دن ضیافت لازم کی گئی ہو، جس کے نظام معاشرت میں سب لوگوں کے لئے بالکل یکساں حقوق اور برابر کے مواقع ہوں، جس کے معاشی نظام میں طبقوں کی اجارہ داری کے لئے کوئی جگہ نہ ہو اور جائز کسب معاش کے دروازے سب کے لئے کھلے ہوں، جس کے نظام تعلیم و تربیت نے ملک کے عام افراد میں خدا کا خوف اور اس کی رضا کا شوق پیدا کر دیا ہو، جس کے اخلاقی ماحول میں فیاضی، مصیبت زدوں کی دست گیری، حاجت مندوں کی اعانت اور گرتوں کو سہارا دینے کا عام چرچا ہو، اور جس کے بچے بچے کو یہ سبق دیا گیا ہو کہ تو مومن نہیں ہے اگر تیرا ہمسایہ بھوکا ہو اور تو خود پیٹ بھر کر کھانا کھا بیٹھے۔ یہ حکم آپ کی موجودہ سوسائٹی کے لئے نہیں دیا گیا تھا جس میں کوئی شخص کسی کو قرض بھی سود کے بغیر نہیں دیتا، جس میں بیت المال کی جگہ بنک اور انشورنس کمپنی ہے، جس میں حاجت مند کے لئے مدد کو بڑھنے والے ہاتھ کی جگہ دھتکار اور پھٹکار ہے، جس کا اخلاقی نقطۂ نظر یہ ہے کہ ایک شخص کی کمائی میں دوسروں کا کوئی حصہ نہیں بلکہ ہر شخص اپنی کفالت کا خود ذمہ دار ہے، جس کا معاشرتی نظام بعض خاص طبقوں کو مخصوص امتیازی حقوق دیتا ہے، جس کا معاشی نظام چند خوش نصیب اور چالاک لوگوں کو ہر طرف سے دولت سمیٹ لینے کا موقع دیتا ہے، اور جس کا سیاسی نظام اپنے قوانین کے ذریعے سے اُن کے مفاد کی حفاظت کرتا ہے۔ ایسی سوسائٹی میں تو چور کا ہاتھ کاٹنا کیا معنی، شاید اکثر حالات میں تو اُس کو سرے سے کوئی سزا دینا ہی درست نہیں ہے۔ کیونکہ اس قسم کی ایک سوسائٹی میں چوری کو جرم قرار دینا دراصل یہ معنی رکھتا ہے کہ خود غرض اور حرام خور لوگوں کے مال کی حفاظت پیش نظر ہے۔ برعکس اس کے اسلام وہ سوسائٹی پیدا کرتا ہے جس میں کسی شخص کے لئے چوری پر مجبور ہونے کا کوئی موقع نہ رہے، ہر ضرورت مند انسان کی جائز ضروریات پوری کرنے کے لئے

لوگ خود ہی رضا کارانہ طور پر آمادہ ہوں، اور حکومت کی طرف سے بھی اس کی دستگیری کا پورا انتظام ہو پھر جو شخص اس کے باوجود چوری کرے اس کے لئے اسلامی قانون ہاتھ کاٹنے کی عبرتناک سزا تجویز کرتا ہے، کیونکہ ایسا شخص ایک شریف، عادل اور فیاض سوسائٹی میں رہنے کے قابل نہیں ہے۔

اسی طرح اسلامی قانونِ تعزیرات زنا پر سو کوڑے مارتا ہے اور شادی شدہ زناکار کو سنگسار کر دیتا ہے۔ مگر کس سوسائٹی میں؟ اس میں جس کے پورے نظام تمدن کو شہوت انگیز اسباب سے خالی کیا گیا ہو، جس میں عورتوں اور مردوں کی مخلوط معاشرت نہ ہو، جس میں بنی سنوری عورتوں کا منظرِ عام پر آنا بند ہو، جس میں نکاح کو نہایت آسان کر دیا گیا ہو، جس میں نیکی اور تقویٰ اور پاکیزگی اخلاق کا عام چرچا ہو، اور جس کے ماحول میں خدا کی یاد ہر وقت تازہ ہوتی رہتی ہو۔ یہ حکم اس گندی سوسائٹی کے لئے نہیں ہے جس میں ہر طرف جنسی جذبات کو بھڑکانے کے اسباب پھیلے ہوئے ہیں، گلی گلی اور گھر گھر فحش گیت بج رہے ہیں، جگہ جگہ فلم اسٹاروں کی تصویریں لٹکی ہوئی ہیں، شہر شہر اور قصبے قصبے سینما درسِ عشق دے رہے ہیں، نہایت گندا لٹریچر آزادی کے ساتھ شایع ہو رہا ہے، بنی سنوری خواتین کھلے بندوں پھر رہی ہیں، زندگی کے ہر شعبے میں جنسی اختلاط کے مواقع بڑھ رہے ہیں اور نظامِ معاشرت نے اپنے بیہودہ رواجوں سے نکاح کو نہایت مشکل بنا دیا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسی سوسائٹی میں تو زنا کرنے والے کو سزا دینے کے بجائے زنا سے پرہیز کرنے والے کو انعام یا کم از کم خان بہادری کا خطاب ملنا چاہیئے۔

شریعت کا قانونی حصہ

اس بحث سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ جدید اصطلاح کے مطابق شریعت کے جس حصہ کو ہم قانون کے لفظ سے تعبیر کرتے ہیں وہ زندگی کی ایک مکمل اور جامع اسکیم کا ایک جزء ہے۔ یہ جزء بجائے خود کوئی مستقل چیز نہیں ہے کہ کل سے الگ کر کے اسے سمجھا جا سکے یا جاری کیا جا سکے۔ اگر ایسا کیا بھی جائے تو یہ اسلامی قانون کا اجراء نہ ہوگا، نہ اس سے وہ نتائج حاصل ہو سکیں گے جو اسلام کے پیش نظر ہیں، اور نہ یہ حرکت خود شارع کے منشا کے مطابق ہوگی۔ شارع کا اصل منشا اپنی پوری اسکیم کو اجتماعی زندگی میں جاری کرنا ہے اور اس اسکیم کے مجموعی عمل درآمد ہی میں اسلامی قانون کا اجرا صحیح طور پر ہو سکتا ہے۔

شریعت کی یہ اسکیم عملی لحاظ سے کئی حصوں پر مشتمل ہے۔ اس کے بعض حصے ایسے ہیں جن کو نافذ کرنا ہر مومن کا اپنا کام ہے، کوئی خارجی طاقت ان کو نافذ نہیں کرا سکتی۔ بعض اور حصے ایسے ہیں جنہیں اسلام اپنے تزکیۂ نفس اور تربیت اخلاق اور تعلیم و تدریس کے پروگرام سے نافذ کراتا ہے۔ بعض دوسرے حصوں کو جاری کرنے کے لئے وہ رائے عام کی طاقت استعمال کرتا ہے۔ بعض اور حصوں کو وہ مسلم سوسائٹی کے صلاح یافتہ رواجوں کی شکل میں نافذ کرتا ہے۔ اور ان سب کے ساتھ ایک حصہ بہت بڑا حصہ ایسا ہے جسے نافذ کرنے کے لئے وہ تقاضا کرتا ہے کہ مسلم سوسائٹی اپنے اندر سیاسی اقتدار پیدا کرے کیونکہ وہ اقتدار کے بغیر نافذ نہیں ہو سکتا۔ یہ سیاسی اقتدار اس غرض کے لئے درکار ہے کہ شریعت کے تجویز کردہ نظام زندگی کی حفاظت کرے، اس کو بگڑنے سے روکے، اس کے منشا کے مطابق بھلائیوں کے نشوونما اور برائیوں کے استیصال کا انتظام کرے، اور اس کے ان احکام کو نافذ کرے جن کی تنفیذ کے لئے ایک نظام عدالت کا ہونا ضروری ہے۔

یہی آخری حصہ وہ چیز ہے جسے ہم اسلامی قانون کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ اگرچہ ایک لحاظ سے پوری شریعت ہی قانون ہے، کیونکہ وہ رعیت پر حاکم کا مقرر کیا ہوا مجموعہ احکام ہے۔ لیکن چونکہ اصطلاح میں "قانون" کا اطلاق ان احکام پر ہوتا ہے جو سیاسی اقتدار کے ذریعہ سے نافذ کئے جائیں، اس لئے ہم شریعت کے صرف اس حصہ کو "قانونِ اسلام" قرار دیتے ہیں جسے نافذ کرنے کے لئے وہ خود اپنے اصول و مزاج کے مطابق ایک سیاسی اقتدار کی تشکیل چاہتی ہے۔

اسلامی قانون کے اہم شعبے

اس سیاسی اقتدار کی تشکیل کے لئے سب سے پہلے ایک دستوری قانون (Constitutional Law) کی ضرورت ہے، اور شریعت نے اس کے تمام ضروری اصول مقرر کر دیے ہیں۔ ریاست کا اساسی نظریہ کیا ہے؟ اس کے قیام کا مقصد کیا ہے؟ کون لوگ اس کے شہری ہو سکتے ہیں؟ ان کے حقوق اور واجبات کیا ہیں؟ کس بنیاد پر کسی کو حقوق شہریت ملتے اور کس بنا پر وہ سلب ہو سکتے ہیں؟ اسلامی ریاست میں غیر مسلم شہریوں (ذمیوں) کے حقوق و واجبات کیا ہیں؟ ریاست کے قانون اور اختیارات کا ماخذ کیا ہے؟ حکومت کا انتظام

کن اصولوں پر چلایا جائیگا؟ انتظامی اختیارات کس کے سپرد کئے جائیں گے؟ اس کا تقرر کون کریگا، کس کے سامنے وہ جوابدہ ہوگا، اور کن حدود کے اندر رہ کر کام کریگا؟ قانون سازی کے اختیارات کس کو کس حد تک حاصل ہونگے؟ عدالت کے حقوق و فرائض کیا ہونگے؟ دستوری قانون کے ان تمام بنیادی مسائل کا واضح جواب شریعت نے ہم کو دے دیا ہے۔ پھر ان اصولوں کو صاف صاف متعین کرنے کے بعد وہ ہمیں آزاد چھوڑ دیتی ہے کہ دستور کی تفصیلی شکل و صورت ہم خود اپنے حالات اور ضروریات کے مطابق بنالیں۔ ہم اس امر کے پابند تو ضرور کئے گئے ہیں کہ اپنی ریاست کے دستور میں شریعت کے مقرر کئے ہوئے ان اصولوں پر قائم رہیں، لیکن کوئی مفصل دستور ہر زمانے کے لئے ہم کو بنا کر نہیں دے دیا گیا ہے جس کے اندر فروعی ردوبدل بھی جائز نہ ہو۔

تشکیل کے بعد اسلامی ریاست کو اپنا نظام چلانے کے لئے ایک انتظامی قانون (Administrative Law) کی ضرورت ہے، سو اس کے بھی تمام بنیادی اصول شریعت نے واضح کر دئیے ہیں، اور مزید براں اس معاملہ میں ہماری رہنمائی کے لئے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین کی مثالی حکومت کے نظائر بھی موجود ہیں۔ ایک اسلامی ریاست اپنی آمدنی کے لئے کس قسم کے ذرائع اختیار کر سکتی ہے اور کس قسم کے ذرائع اختیار نہیں کر سکتی؟ حکومت کے واصلات میں کس قسم کے تصرفات درست ہیں اور کس قسم کے نادرست؟ فوج، پولیس، عدالت اور نظم و نسق کے مختلف شعبوں میں حکومت کا رویہ کیا ہونا چاہئے؟ باشندوں کی اخلاقی اور مادی فلاح کے لئے حکومت پر کیا فرائض عائد ہوتے ہیں؟ کونسی بھلائیاں ہیں جنھیں قائم کرنے اور فروغ دینے کے لئے اسے کوشش کرنی چاہئے اور کونسی برائیاں ہیں جنھیں روکنا اور دبانا اس کے فرائض میں سے ہے؟ باشندگانِ ملک کے معاملات زندگی میں حکومت کس حد تک دخل انداز ہونے کی مجاز ہے؟ ان امور میں شریعت ہم کو محض اصولی ہدایات ہی نہیں دیتی بلکہ خاص خاص مسائل کے متعلق قطعی اور صریح احکام بھی دیتی ہے۔ لیکن پورے نظم و نسق کے متعلق اس نے کوئی تفصیلی ضابطہ بنا کر ہمیں نہیں دیدیا ہے جسے ایک ہی شکل و صورت پر ہمیشہ اور ہر زمانے میں قائم رکھنے پر ہم مامور ہوں اور جس میں کسی قسم کا تغیر و تبدل کرنے کی ہمیں اجازت نہ ہو۔ دستوری

قانون کی طرح انتظامی قانون میں بھی تفصیلی ضوابط بنانے کی پوری آزادی ہمیں حاصل ہے، البتہ اس آزادی کو ہم اُن اصول اور حدود کے اندر ہی استعمال کر سکتے ہیں جو شریعت نے مقرر کر دئے ہیں۔

اس کے بعد اجتماعی قانون (Public Law) اور شخصی قانون (Private Law) کے وہ ابواب آتے ہیں جو معاشرے میں امن اور انصاف قائم کرنے کے لئے ضروری ہیں۔ ان ابواب میں شریعت اتنے وسیع پیمانے پر ہمیں تفصیلی احکام اور اصولی ہدایات دیتی ہے کہ کسی دور میں اور معاملاتِ زندگی کے کسی گوشے میں بھی ہم کو اپنی قانونی ضرورتوں کی تکمیل کے لئے شرعی حدود سے باہر جانے کی ضرورت پیش نہیں آسکتی۔ جو تفصیلی احکام اس نے دئے ہیں وہ ابتک ہر ملک اور ہر دور کی سوسائٹی میں یکساں صحت کے ساتھ جاری ہو سکتے ہیں (بشرطیکہ زندگی کا وہ مجموعی نظام بھی، جس میں آپ ان احکام کو جاری کریں، اسلام کی ہدایت پر چل رہا ہو)، اور جو اصولی ہدایات اس نے دی ہیں وہ اس قدر جامع ہیں کہ قریب قریب اکثر معاملات زندگی میں تمام ضروری قوانین ان کی روشنی میں بنائے جا سکتے ہیں۔ پھر جن معاملات میں شریعت کسی قسم کے احکام اور ہدایات نہیں دیتی، ان میں خود شریعت ہی کی رو سے اسلامی ریاست کے اہل الرائے اور اصحاب حل وعقد باہمی مشورے سے قوانین بنانے کے مجاز ہیں، اور اس طرح جو قوانین بنائے جائیں گے وہ قانون اسلام ہی کا ایک جزء شمار ہوں گے، کیونکہ وہ شریعت کی دی ہوئی اجازت کے تحت بنائے گئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام کی ابتدائی صدیوں میں ہمارے فقہاء نے استحسان اور مصالح مرسلہ وغیرہ عنوانات کے تحت جو احکام مدون کئے تھے وہ قانون اسلام ہی کے اجزاء سمجھے گئے۔

سب سے آخر میں قانون کا ایک شعبہ وہ بھی ہے جس کی ایک ریاست کو اپنے بین الاقوامی تعلقات کے لئے ضرورت پیش آتی ہے۔ اس باب میں شریعت نے جنگ اور صلح اور غیر جانبداری کی مختلف حالتوں کے متعلق اسلامی ریاست کا برتاؤ متعین کرنے کے لئے بہت تفصیلی ہدایات دی ہیں، اور جہاں تفصیلات نہیں دیں وہاں ایسے اصول دیدئے ہیں جن کی روشنی میں تفصیلات مرتب کی جا سکتی ہیں۔

اسلامی قانون کا استقلال اور اس کی ترقی پذیری | اس مختصر تشریح سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ علم

قانون کے جتنے شعبوں پر انسانی تصور آج تک پھیل سکا ہے، ان میں سے کوئی شعبہ بھی ایسا نہیں ہے جس میں شریعت نے ہماری رہنمائی نہ کی ہو۔ یہ رہنمائی کس کس شکل میں کی گئی ہے، اس کا اگر تفصیلی جائزہ لے کر دیکھا جائے تو یہ بات اچھی طرح سمجھ میں آسکتی ہے کہ اسلامی قانون میں کیا چیز قطعی اور مستقل ہے اور اس کے ایسا ہونے کا فائدہ کیا ہے، اور کونسی چیز ابد تک ترقی پذیر ہے اور وہ کس طریقہ سے ہر دور میں ہماری بڑھتی ہوئی تمدنی ضروریات کو پورا کر سکتی ہے

اس قانون میں جو چیز اٹل ہے وہ تین اجزاء پر مشتمل ہے۔

(۱) قطعی اور صریح احکام جو قرآن یا ثابت شدہ احادیث میں دئے گئے ہیں، مثلاً شراب اور سود اور قمار کی حرمت، چوری اور زنا اور قذف کی سزائیں، اور میت کے ترکہ میں وارثوں کے حصے۔

(۲) اصولی احکام جو قرآن اور ثابت شدہ احادیث میں بیان ہوئے ہیں مثلاً یہ کہ ہر نشہ آور چیز حرام ہے، یا یہ کہ لین دین کے جن طریقوں میں منافع کا تبادلہ آپس کی رضامندی سے نہ ہو وہ باطل ہیں، یا یہ کہ مرد عورتوں پر قوام ہیں۔

(۳) حدود جو قرآن وسنت میں اس غرض کے لئے مقرر کی گئی ہیں کہ ہم اپنی آزادی عمل کو ان کے اندر محدود رکھیں اور کسی حال میں ان سے تجاوز نہ کریں، مثلاً تعداد ازواج کے لئے بیک وقت چار عورتوں کی حد، یا طلاق کے لئے تین کی حد، یا وصیت کے لئے ایک تہائی مال کی حد۔

اسلامی قانون کا یہ اٹل اور قطعی واجب الاطاعت حصہ ہی دراصل وہ چیز ہے جو اسلامی تہذیب وتمدن کے حدود اربعہ اور اس کی مخصوص امتیازی شکل وصورت معین کرتا ہے۔ آپ کسی ایسی تہذیب وتمدن کی نشان دہی نہیں کر سکتے جو اپنے اندر ایک ناقابل تغیر وتبدل عنصر رکھے بغیر اپنی ہستی اور اپنی انفرادیت کو برقرار رکھ سکے۔ اگر کسی تہذیب میں ایسا کوئی عنصر بھی نہ ہو اور سبھی کچھ قابل ترمیم و تنسیخ ہو تو فی الحقیقت وہ سرے سے کوئی مستقل تہذیب ہی نہیں ہے، وہ تو ایک پگھلا ہوا مادہ ہے جو ہر سانچے میں ڈھل سکتا ہے اور ہر وقت اپنی شکل بدل سکتا ہے۔

علاوہ بریں ان احکام اور اصول اور حدود کا تفصیلی مطالعہ کرنے سے ہر معقول آدمی اس نتیجہ پر

پہنچے گا کہ شریعت نے حکم جہاں بھی دیا ہے ایسے موقع پر دیا ہے جہاں انسانی قوتِ فیصلہ غلطی کر کے "معروف" سے ہٹ سکتی ہے۔ ایسے تمام مواقع پر شریعت صاف حکم دے کر، یا صریحاً منع کر کے یا اصول بتا کر، یا حد لگا کر گویا نشانات راہ (sign posts) کھڑے کر دیتی ہے تاکہ ہمیں معلوم ہو جائے کہ صحیح راستہ کس طرف ہے۔ یہ نشانات ہماری رفتار ترقی کو روکنے والے نہیں ہیں بلکہ ہمیں سیدھی راہ پر لگانے اور ہمارے سفرِ زندگی کو بے راہ روی سے بچانے کے لئے ہیں۔ ان مستقل قوانین کا ایک معتدبہ حصہ ایسا ہے جن پر کل تک دنیا اعتراض کر رہی تھی، مگر ہمارے دیکھتے دیکھتے تجربات اور تلخ تجربات نے کل کے معترضین کو آج معترف بنا دیا ہے اور انہی قوانین کی خوشہ چینی پر وہ مجبور ہو رہے ہیں۔ مثال کے طور پر میں صرف اسلام کے قانون ازدواج اور قانون میراث کی طرف اشارہ کافی سمجھتا ہوں۔

اس پائدار اور اٹل عنصر کے ساتھ ایک دوسرا عنصر ایسا ہے جو اسلامی قانون میں بے اندازہ وسعت پیدا کرتا ہے اور اسے زمانہ کے تمام بدلتے ہوئے حالات میں ترقی پذیر بناتا ہے۔ یہ عنصر کئی اقسام پر مشتمل ہے۔

(۱) تعبیر یا تاویلِ احکام، یعنی کوئی حکم جن الفاظ میں دیا گیا ہو ان کا مفہوم سمجھنے اور ان کا منشا متعین کرنے کی کوشش کرنا۔ یہ فقہ اسلامی کا ایک بہت ہی وسیع باب ہے۔ قانونی دماغ اور نکتہ رس نگاہ رکھنے والے لوگ جب کتاب و سنت میں غور و خوض کرتے ہیں تو وہ شریعت کے صریح احکام میں بھی مختلف تعبیرات کی گنجائش پاتے ہیں اور ان میں سے ہر ایک اپنے فہم و بصیرت کے مطابق کسی ایک تعبیر کو بدلائل دوسری تعبیر پر ترجیح دیتا ہے۔ یہ اختلاف تعبیر پہلے بھی اُمت کے اہل علم میں رہا ہے، آج بھی ہو سکتا ہے اور آئندہ بھی یہ دروازہ کھلا رہیگا۔

(۲) قیاس، یعنی جس معاملہ میں کوئی صاف حکم نہ ملتا ہو اس پر کسی ایسے حکم کو جاری کرنا جو اس سے ملتے جلتے کسی معاملہ میں دیا گیا ہو۔

(۳) اجتہاد، یعنی شریعت کے اصولی احکام اور جامع ہدایات کو سمجھ کر ایسے معاملات پر ان کو منطبق کرنا جن میں نظائر بھی نہ ملتے ہوں۔

(۴) استحسان، یعنی مباحات کے غیر محدود دائرے میں حسب ضرورت ایسے قوانین اور ضوابط وضع کرنا جو اسلام کے مجموعی نظام کی روح سے زیادہ سے زیادہ مطابقت رکھتے ہوں۔

یہ چاروں چیزیں ایسی ہیں جن کے امکانات پر اگر کوئی شخص غور کرے تو وہ کبھی اس شبہ میں نہیں پڑ سکتا کہ اسلامی قانون کا دامن کسی وقت بھی انسانی تمدن کی روزافزوں ضروریات اور متغیر حالات کے لیے تنگ ہو سکتا ہے۔ لیکن یہ یاد رکھئے کہ اجتہاد و استحسان ہو یا تعبیر و قیاس، بہرحال اس کا مجاز ہر کس و ناکس نہیں ہو سکتا۔ آپ ہر راہ رو کا یہ حق تسلیم نہیں کر سکتے کہ وہ موجودہ ملکی قانون کے کسی مسئلہ پر فیصلہ صادر کر دے۔ اس کے لئے قانونی تعلیم اور ذہنی تربیت کا ایک خاص معیار آپ کے نزدیک بھی ناگزیر ہے جس پر پورا اُترے بغیر کوئی شخص ماہرانہ رائے زنی کا اہل نہیں مانا جا سکتا۔ اسی طرح اسلامی قانون کے مسائل پر بھی رائے زنی کا حق صرف انہی لوگوں کو دیا جا سکتا ہے جنھوں نے اس کی ضروری اہلیت بہم پہنچائی ہو۔ تعبیر احکام کے لئے ضروری ہے کہ آدمی اس زبان کی نزاکتوں سے واقف ہو جس میں احکام دیئے گئے ہیں، ان حالات سے واقف ہو جن میں ابتداءً یہ احکام دیئے گئے تھے، قرآن کے انداز بیان کو اچھی طرح سمجھتا ہو اور حدیث کے ذخیرے پر وسیع نگاہ رکھتا ہو۔ قیاس کے لئے ضروری ہے کہ آدمی اتنی لطیف قانونی حس رکھتا ہو کہ ایک معاملہ کو دوسرے معاملہ پر قیاس کرتے ہوئے ان کی مماثلت کے پہلوؤں کو ٹھیک ٹھیک سمجھ سکے، ورنہ ایک کا حکم دوسرے پر منطبق کرنے میں وہ غلطی سے نہیں بچ سکتا۔ اجتہاد کے لئے شریعت کے احکام میں گہری بصیرت اور معاملات زندگی کا عمدہ فہم ـــــ محض عام فہم ہی نہیں بلکہ اسلامی نقطۂ نظر سے فہم ـــــ درکار ہے۔ استحسان کے لئے بھی ناگزیر ہے کہ آدمی اسلام کے مزاج اور اس کے نظام زندگی کو اچھی طرح سمجھتا ہو تاکہ مباحات کے دائرے میں جو قوانین اور ضوابط وہ تجویز کرے وہ اس نظام زندگی کے مجموعہ میں صحیح طور پر جذب ہو سکیں۔ ان علمی اور ذہنی صلاحیتوں سے بڑھ کر ایک اور چیز بھی درکار ہے جس کے بغیر اسلامی قانون کا ارتقاء کبھی صحیح خطوط پر نہیں ہو سکتا، اور وہ یہ ہے کہ جو لوگ اس کام کو انجام دیں اُن کے اندر اسلام کی پیروی کا ارادہ اور خدا کے سامنے اپنی جوابدہی کا احساس موجود ہو یقیناً یہ کام اُن لوگوں کے کرنے کا نہیں ہے جو خدا اور آخرت سے بے پروا ہو کر محض دنیوی مصلحتوں پر

نگاہ جما چکے ہوں اور اسلامی قدروں کو چھوڑ کر کسی دوسری تہذیب کی قدریں پسند کر چکے ہوں۔ ایسے لوگوں کے ہاتھوں اسلامی قانون کا ارتقا نہیں ہوسکتا، صرف اس میں تحریف ہی ہوسکتی ہے۔

اعتراضات اور جوابات

اب میں مختصر طور پر اُن اعتراضات سے بحث کرونگا جو پاکستان میں اسلامی قانون کے اجراء کا مطالبہ سُن کر بالعموم کئے جاتے ہیں۔ یہ اعتراضات بظاہر تو بہت سے ہیں، اس لئے کہ ان کے بیان کرنے میں الفاظ کی فضول خرچی ذرا دل کھول کر کی جاتی ہے۔ لیکن سب کا تجزیہ کرنے سے اصل اعتراض صرف چار نکلتے ہیں۔

تہمتِ بوسیدگی

پہلا اعتراض یہ ہے کہ صدیوں کا پُرانا قانون جدید زمانے کی ایک سوسائٹی اور اسٹیٹ کی ضروریات کے لئے کس طرح کافی ہوسکتا ہے؟

جن حضرات کی طرف سے یہ اعتراض پیش کیا جاتا ہے، مجھے شبہ ہے کہ وہ اسلامی قانون کے متعلق ابتدائی اور سرسری واقفیت بھی رکھتے ہیں یا نہیں۔ غالباً انہوں نے کہیں سے بس یہ اُڑتی اڑتی خبر سُن لی ہے کہ اس قانون کے بنیادی احکام اور اصول ساڑھے تیرہ سو برس پہلے بیان ہوئے تھے۔ اس کے بعد یہ بات انہوں نے بطور خود فرض کرلی کہ اس وقت سے یہ قانون جوں کا توں اسی حالت میں رکھا ہوا ہے۔ اسی بنا پر انہیں یہ اندیشہ لاحق ہوگیا کہ اگر آج ایک جدید ریاست اسے اپنا ملکی قانون بنالے تو وہ اس کی وسیع ضروریات کے لئے کیسے کافی ہوسکے گا۔ ان لوگوں کو یہ معلوم نہیں ہے کہ جو بنیادی احکام واصول ساڑھے تیرہ سو برس پہلے دئے گئے تھے اُن پر اسی وقت ایک ریاست قائم ہوگئی تھی اور روزمرہ پیش آنے والے معاملات میں تعبیر وقیاس اور اجتہاد و استحسان کے ذریعہ سے اس قانون کا ارتقا اوّل روز ہی سے شروع ہوگیا تھا۔ پھر اسلامی اقتدار وسیع ہو کر بحر الکاہل سے بحر اوقیانوس تک آدھی سے زیادہ مہذب دنیا پر پھیل گیا اور جتنی ریاستیں بھی بعد کے بارہ سو سال میں مسلمانوں نے قائم کیں ان سب کا پورا نظم ونسق اسی قانون پر چلتا رہا۔ ہر دور اور ہر ملک کے حالات و ضروریات کے مطابق اس قانون میں مسلسل توسیع ہوتی رہی ہے۔ انیسویں صدی عیسوی کی ابتداء تک اس ارتقاء کا سلسلہ ایک دن کے لئے بھی نہیں رُکا ہے۔ خود آپ کے اس ملک میں بھی انیسویں صدی کے اوائل تک اسلام ہی کا دیوانی

اور فوجداری قانون جاری رہا ہے۔ اب زیادہ سے زیادہ صرف سو سال کا وقفہ ایسا رہ جاتا ہے جس کے متعلق آپ کہہ سکتے ہیں کہ اس زمانہ میں اسلامی قانون پر عمل درآمد بند رہا اور اس کا ارتقاء رکا رہا۔ لیکن اول تو یہ وقفہ کچھ اتنا زیادہ بڑا نہیں ہے کہ ہم تھوڑی سی محنت و کاوش سے اس کے نقصان کی تلافی نہ کر سکیں۔ دوسرے ہمارے پاس ہر صدی کی فقہی ترقیات کا پورا ریکارڈ موجود ہے جسے دیکھ کر ہم معلوم کر سکتے ہیں کہ ہمارے اسلاف پہلے کتنا کام کر چکے ہیں اور آگے ہمیں کیا کام کرنا ہے۔ پھر جن بنیادوں پر اسلامی قانون کا ارتقاء ہوتا ہے، انھیں دیکھتے ہوئے کوئی صاحب علم آدمی اس امر میں شک نہیں کر سکتا کہ جس طرح پچھلی ۱۲ صدیوں میں یہ قانون ہر دور اور ہر ملک کی ضروریات کے مطابق وسیع ہوتا رہا ہے اسی طرح موجودہ صدی میں بھی ہو سکتا ہے اور آئندہ صدیوں میں بھی ہوتا رہیگا۔ ناواقف لوگ اس کو جانے بغیر ہزار قسم کے وسوسوں میں پڑ سکتے ہیں۔ مگر جو لوگ اس کو جانتے ہیں، اس کے امکانات سے واقف ہیں، اور اس کی تاریخ پر نظر رکھتے ہیں، انہیں ایک لمحہ کے لئے بھی اس پر تنگ دامنی کا شبہ نہیں ہو سکتا۔

الزام وحشت دوسرا اعتراض، جو پبلک میں تو دبی زبان سے مگر نجی صحبتوں میں بڑی کافرانہ جسارتوں کے ساتھ کیا جاتا ہے یہ ہے کہ اسلامی قانون میں بہت سی چیزیں قرون وسطیٰ کی تاریک خیالی کے باقیات میں سے ہیں جنھیں اس مہذب دور کے ترقی یافتہ اخلاقی تصورات کسی طرح برداشت نہیں کر سکتے۔ مثلاً ہاتھ کاٹنے اور درّے مارنے اور سنگسار کرنے کی وحشیانہ سزائیں۔

یہ اعتراض سن کر بے اختیار ان حضرات سے یہ کہنے کو جی چاہتا ہے کہ

اتنی نہ بڑھا پاکی داماں کی حکایت
دامن کو ذرا دیکھ ذرا بند قبا دیکھ

جس دور میں ایٹم بم استعمال کیا گیا ہے، اس کے اخلاقی تصورات کو ترقی یافتہ کہتے وقت آدمی کو کچھ تو شرم محسوس ہونی چاہئیے۔ آج کا نام نہاد مہذب انسان دوسرے انسانوں کے ساتھ جو سلوک کر رہا ہے اس کی مثال تو قدیم تاریخ کے کسی تاریک سے تاریک دور میں بھی نہیں ملتی۔ وہ سنگسار

نہیں بم مار کرتا ہے۔ محض ہاتھ ہی نہیں کاٹتا، جسم کے پرخچے اڑا دیتا ہے۔ دُرّے برسانے سے اس کا دل نہیں بھرتا، زندہ آگ میں جلاتا ہے اور مُردہ لاشوں کی چربی نکال کر ان کے صابن بناتا ہے۔ جنگ کے ہنگامۂ غیظ و غضب ہی میں نہیں، امن کے ٹھنڈے ماحول میں بھی جن کو وہ سیاسی مجرم، یا قومی مفاد کا دشمن، یا معاشی اغراض کا حریف سمجھتا ہے ان کو دردناک عذاب دینے میں وہ آخر کونسی کسر اٹھا رکھتا ہے؟ ثبوت جرم سے پہلے محض شبہ ہی شبہ میں تفتیش کے جو طریقے اور اقبال جرم کرانے کے جو ہتھکنڈے آج کی مہذب حکومتوں میں اختیار کئے جا رہے ہیں وہ کس سے چھپے ہوئے ہیں۔ ان ساری باتوں کی موجودگی میں یہ دعویٰ تو کسی طرح صحیح نہیں ہے کہ آج کے نام نہاد ترقی یافتہ تصورات انسان کو انسان کے ہاتھوں عذاب پاتے ہوئے دیکھنا سرے سے گوارا ہی نہیں کرتے۔ گوارا تو وہ کر رہے ہیں اور پہلے سے زیادہ سخت عذابوں کو گوارا کر رہے ہیں۔ البتہ فرق جو کچھ واقع ہوا ہے وہ دراصل اخلاقی قدروں میں ہے۔ ان کے نزدیک جو جرائم واقعی سخت ہیں اُن پر وہ خوب عذاب دیتے ہیں اور دل کھول کر دیتے ہیں، مثلاً ان کے سیاسی اقتدار کو چیلنج کرنا، یا ان کے معاشی مفاد میں مزاحم ہونا۔ لیکن جن افعال کو وہ سرے سے جرم ہی نہیں سمجھتے، مثلاً شراب سے ایک گونہ بیخودی حاصل کر لینا، یا تفریحاً زنا کر لینا، ان پر عذاب تو درکنار، سرزنش اور ملامت بھی انھیں ناگوار ہوتی ہے۔ اور جرم نہ سمجھنے کی صورت میں لامحالہ وہ ناگوارِ خاطر ہونی ہی چاہیئے۔

اب میں ان معترضین سے پوچھتا ہوں کہ آپ کن اخلاقی قدروں کے قائل ہیں؟ اسلام کی اخلاقی قدریں؟ یا موجودہ تہذیب کی؟ اگر آپ کی قدریں بدل چکی ہیں، اگر حلال و حرام اور خطا و صواب اور نیکی و بدی کے وہ معیار آپ چھوڑ چکے ہیں جو اسلام نے مقرر کئے تھے اور دوسرے معیار آپ نے دل سے قبول کر لئے ہیں، تو پھر اسلام کے دائرے میں آپ کی جگہ ہے کہاں کہ آپ اس کے قوانین میں ترمیم کی گفتگو چھیڑیں۔ آپ کا مقام اندر نہیں باہر ہے۔ اپنی ملت الگ بنائیے، کوئی اور نام اپنے لئے تجویز کیجئے، اور صاف صاف یوں کہئے کہ ہم اسلام کو بحیثیت ایک دین کے رد کرتے ہیں۔ جس خدا کی مقرر کی ہوئی سزاؤں کو آپ وحشیانہ سمجھتے ہیں، اس پر ایمان لانے کا آخر کس احمق نے آپ کو مشورہ دیا ہے،

اور کون احمق یہ باور کر سکتا ہے کہ اس کی بات کو وحشیانہ کہنے کے بعد آپ اس پر ایمان بھی رکھتے ہیں۔

فقہی اختلافات کا بہانہ تیسرا اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ اسلام میں بہت سے فرقے ہیں اور ہر فرقے کی فقہ جدا ہے، اب اگر یہاں اسلامی قانون جاری کرنے کا فیصلہ کیا جائے تو آخر وہ کس فرقے کی فقہ کے مطابق ہوگا؟

یہ وہ اعتراض ہے جس پر اسلامی قانون کے مخالفین بڑی اُمیدیں لگائے بیٹھے ہیں۔ وہ توقع رکھتے ہیں کہ آخر کار اسی سوال پر مسلمانوں میں پھوٹ ڈال کر وہ اسلام کے "خطرے" کو ٹال سکینگے۔ خود مسلمانوں میں وہ لوگ جو حقیقت سے پوری طرح واقف نہیں ہیں، اس سوال پر اکثر پریشان ہو جاتے ہیں کہ اس پیچیدگی کو آخر کیسے حل کیا جائیگا۔ حالانکہ درحقیقت یہ سرے سے کوئی پیچیدگی ہے ہی نہیں، اور پچھلی بارہ صدیوں میں اس مسئلے نے کبھی اور کہیں اسلامی قانون کے نفاذ کو نہیں روکا ہے۔

سب سے پہلے یہ سمجھ لیجئے کہ اسلامی قانون کا بنیادی ڈھانچہ، جو خدا اور رسول کے مقرر کئے ہوئے قطعی احکام اور اصول اور حدود پر مشتمل ہے، مسلمانوں کے مختلف فرقوں میں ابتدا سے آج تک یکساں مسلّم رہا ہے۔ اس میں کوئی اختلاف نہ پہلے تھا، نہ اب پایا جاتا ہے۔ فقہی اختلافات جتنے بھی ہوئے ہیں، تعبیراتِ احکام میں، قیاسی و اجتہادی مسائل میں، اور دائرۂ اباحت کے قوانین و ضوابط میں ہوئے ہیں۔

پھر ان اختلافات کی حقیقت بھی یہ ہے کہ کسی حکم کی کوئی تعبیر جو کسی عالم نے کی ہو، یا کوئی مسئلہ جو قیاس و اجتہاد سے کسی امام نے نکالا ہو، یا کوئی فتویٰ جو استحسان کی بنا پر کسی مجتہد نے دیا ہو، بجائے خود قانون نہیں بن جاتا۔ دراصل اس کی حیثیت محض ایک تجویز کی ہوتی ہے۔ قانون وہ صرف اسی وقت بنتا ہے جبکہ اس پر اجماع (اتفاق رائے) ہو جائے یا جمہور (اکثریت) اس کو تسلیم کر لیں اور فتویٰ اسی پر جاری ہو جائے۔ ہمارے فقہا جب اپنی کتابوں میں کسی مسئلے کو بیان کرنے کے بعد لکھا کرتے ہیں کہ علیہ الاجماع یا علیہ الجمہور او علیہ الفتوٰی، تو اس سے ان کا مطلب یہی ہوتا ہے کہ اس مسئلے کے متعلق یہ رائے اب محض رائے یا تجویز نہیں رہی ہے بلکہ اتفاق رائے یا جمہوری فیصلے

کی بنا پر اب یہ قانون بن چکی ہے۔

یہ اجماعی اور جمہوری فیصلے بھی دو قسم کے ہیں۔ ایک وہ جن پر تمام اُمت کا ہمیشہ اجماع رہا ہے، یا دنیائے اسلام کی اکثریت نے جن کو قبول کرلیا ہے، دوسرے وہ جن پر کسی زمانہ کسی ملک کے مسلمانوں کا اجماع ہو جائے یا ان کی اکثریت انھیں قبول کرلے۔

پہلی قسم کے فیصلے اگر اجماعی ہوں تو وہ نظر ثانی کے قابل نہیں ہیں۔ انہیں تمام مسلمانوں کو بحیثیت ایک قانون کے قبول کرنا ہوگا۔ اور اگر وہ جمہوری فیصلے ہوں، تو ان کے متعلق یہ دیکھنا ہوگا کہ ہم جس زمانہ میں اسلامی قانون جاری کر رہے ہیں، اس کی اکثریت بھی انہیں تسلیم کرتی ہے یا نہیں؟ اگر اکثریت انہیں تسلیم کرتی ہو تو وہ ملک کا قانون قرار پائینگے۔

یہ حیثیت تو پچھلے فقہی ادوار کی ہے۔ رہا آئندہ کا معاملہ، تو آگے پیش آنے والے معاملات میں خدا اور رسول کی جس تعبیر، یا جس قیاس و اجتہاد اور جس استحسان پر ہمارے ملک کے اہل حل وعقد کا اجماع ہو جائیگا، یا ان کی اکثریت اس کو اختیار کریگی وہ ہمارے ملک کے لئے قانون ہوگا۔ پہلے بھی ہر مسلمان ملک کا قانون ایسے ہی فتاوی پر مشتمل ہوتا تھا جو ملک کی تمام یا اکثر آبادی کے نزدیک مسلم ہوتے تھے، اور آج بھی صرف یہی ایک صورت قابل عمل ہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ جمہوریت کے اصول پر اس کے سوا اور کونسی صورت تجویز کی جاسکتی ہے۔

اب رہا یہ سوال کہ مسلمانوں کے جو گروہ اکثریت کے ساتھ متفق نہ ہوں ان کی پوزیشن کیا ہوگی؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ ایسے قلیل التعداد گروہ پرسنل لا کی حد تک اپنی فقہ کو اپنے معاملات میں جاری کرنے کا مطالبہ کر سکتے ہیں، اور یہ حق ان کو ضرور ملنا چاہیے، لیکن قانون ملکی (Law of the Land) بہرحال وہی ہوگا اور وہی ہو سکتا ہے جو اکثریت کے مسلک پر مبنی ہو۔ میں یقین رکھتا ہوں کہ آج مسلمانوں کا کوئی فرقہ بھی یہ غیر معقول بات کہنے کے لئے تیار نہ ہوگا کہ اسلامی قانون میں ہم متفق نہیں ہیں لہٰذا یہاں کفر کا قانون جاری ہونا چاہیے۔ اسلام میں اختلاف کرکے سب مسلمانوں کا کفر پر متفق ہو جانا ایک ایسی بیہودہ بات ہے جو چند کفر پسند افراد کو چاہے

کتنی ہی پسند ہو، بہر حال کسی فرقے کا مسلمان بھی اسے اپنے دل میں جگہ دینے کے لئے آمادہ نہیں ہو سکتا۔

غیر مسلم اقلیتوں کا مسئلہ آخری اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ اس ملک میں صرف مسلمان ہی نہیں رہتے۔ غیر مسلم بھی آباد ہیں۔ وہ کس طرح یہ گوارا کریں گے کہ مسلمانوں کا مذہبی قانون ان پر مسلط ہو جائے؟

یہ اعتراض جو لوگ پیش کرتے ہیں وہ دراصل اس مسئلہ پر محض ایک سطحی نگاہ ڈالتے ہیں۔ انہوں نے پوری طرح سے اس کا تجزیہ نہیں کیا ہے۔ اسی لئے ان کو اس میں بڑی پیچیدگی نظر آتی ہے۔ حالانکہ تھوڑی سی تحلیل کرنے کے بعد اس کی ساری الجھنیں خود ہی سلجھتی چلی جاتی ہیں۔

ظاہر بات ہے کہ ہم جس قانون پر بحث کر رہے ہیں وہ قانون ملکی ہے نہ کہ قانون شخصی۔ جہاں تک شخصی معاملات کا تعلق ہے، ان کے بارے میں تو یہ مسلم ہے کہ ہر گروہ پر اس کا اپنا قانون ہی جاری ہوگا۔ یہ حق دنیا میں سب سے پہلے اور سب سے زیادہ فیاضی کے ساتھ اسلام نے اہل الذمّہ کو دیا تھا، بلکہ درحقیقت وہ اسلام ہی ہے جس سے موجودہ دور کے اہل قانون نے ملکی قانون اور شخصی قانون کا فرق سیکھا ہے اور یہ اصول معلوم کیا ہے کہ جس ریاست کی آبادی مختلف المذہب لوگوں پر مشتمل ہو اس میں سب گروہوں کے شخصی معاملات ان کے شخصی قوانین ہی کے تحت ہونے چاہئیں۔ لہٰذا کسی غیر مسلم اقلیت کو ہم سے یہ اندیشہ تو ہونا ہی نہ چاہیئے کہ ہم ان کے شخصی معاملات پر اپنے مذہبی قوانین کو مسلط کر کے اس قاعدے کی خلاف ورزی کریں گے جو دراصل ہمارا اپنا ہی قائم کیا ہوا قاعدہ ہے اور جس کے متعلق اسلام نے ہم کو قطعی واضح احکام دے رکھے ہیں۔

اب سوال صرف یہ رہ جاتا ہے کہ اس ملک میں قانونِ ملکی کونسا ہو؟ انصاف کی رو سے اس سوال کا جواب اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ قانون ملکی وہی ہونا چاہئے جو اکثریت کے نزدیک صحیح ہو۔ اقلیت ہم سے اپنا جائز حق ضرور مانگ سکتی ہے اور وہ ہم اس کے مانگنے سے پہلے ہی تسلیم کر رہے ہیں۔ لیکن وہ ہم سے یہ مطالبہ کس طرح کر سکتی ہے کہ اس کو راضی کرنے کے لئے ہم خود اپنے عقیدے کی نفی کریں اور کسی ایسے قانون کو اپنے ہاتھوں جاری کرنے لگیں جس کو ہم حق

نہیں سمجھتے۔ جب تک ہم اپنے ملک میں خود مختار نہ تھے، ہمیں مجبوراً ایک باطل قانون کو گوارا کرنا پڑا۔ اس کی ذمہ داری سے ہم بری ہو سکتے ہیں۔ لیکن اب جبکہ اختیارات ہمارے اپنے ہاتھ میں ہیں، اگر ہم جان بوجھ کر اسلامی قانون کی جگہ کوئی دوسرا قانون جاری کریں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ ہم قومی حیثیت سے بالارادہ مرتد ہو رہے ہیں۔ کیا فی الواقع کسی اقلیت کا یہ حق ہے کہ اس کی خاطر ہم اپنا دین بدلنا گوارا کریں؟ کیا کوئی اقلیت کسی با اختیار اکثریت سے یہ مطالبہ کرنے میں حق بجانب ہے کہ وہ اپنی رائے میں جس چیز کو صحیح سمجھتی ہو اسے چھوڑ دے اور وہ چیز اختیار کرے جسے اقلیت صحیح سمجھتی ہو؟ یا پھر کیا یہ کوئی معقول اصول ہے کہ جس ملک میں مختلف المذہب لوگ آباد ہوں اس میں سب کو لامذہب ہی ہو کر رہنا چاہیئے؟ اگر ان سوالات کا جواب اثبات میں نہیں ہے، تو میں نہیں سمجھتا کہ آخر ایک مسلمان اکثریت کے ملک میں اسلامی قانون کیوں ملکی قانون قرار نہ پائے۔

ہماری نئی زیر طبع مطبوعات

۱۔ **سود** ۔ اس کتاب میں مدیر ترجمان نے سود، بینکنگ، انشورنس وغیرہ کی حقیقت و ماہیت پر بحث کی ہے اور ان سے متعلقہ معاشی نظریات و مسائل پر اسلامی نقطۂ نظر سے تنقید کی ہے ضخامت ۔۔۔ ۴۰ صفحات قیمت ۔

۲۔ **الجہاد فی الاسلام** ۔ یہ کتاب عرصے سے نایاب اور غیر مطبوع تھی۔ اب اسے دوبارہ چھپوایا جارہا ہے۔

۳۔ **منہاج الانقلاب الاسلامی** "یہ اسلامی حکومت کس طرح قائم ہوتی ہے" کا عربی ترجمہ ہے جو مولانا مسعود عالم ندوی نے کیا ہے۔ ضخامت ۵۰ صفحات قیمت عہ

۴۔ **الدین القیم** ۔ یہ دین حق کا عربی ترجمہ ہے جو مترجم موصوف نے ہی کیا ہے۔ ضخامت ۵۰ صفحات قیمت عہ

۵۔ **نظریۃ الاسلام السیاسیۃ** ۔ یہ اسلام کا نظریہ سیاسی کا عربی ترجمہ ہے، چھپ چکا ہے۔ ضخامت ۵۰ صفحات قیمت عہ

۶۔ **تفہیمات** ۔ بھی دوبارہ طبع ہو چکی ہے۔

مکتبہ جماعت اسلامی، اچھرہ، لاہور